محمد اظہار الحق

ہیرو

ایک دانشور دوست نے پوچھا ہے کہ اس قوم کے ہیرو کون ہیں؟ اتفاق سے اسی دن اخبار میں ایک مراسلہ چھپا ،جس میں اس بات پر تاسف کا اظہار کیا گیا تھا بلکہ شرم دلائی گئی تھی کہ ہمارے ہیرو ہماری توجہ سے محروم ہیں اور ہم من حیث القوم اس قابل ہی نہیں کہ قدرت ہمیں ہیرو عطا کرے۔ وجہ یہ تھی کہ ایک بڑے کرکٹ سٹار پر کسی من چلے نے تنقید کر دی تھی اور یہ بات مراسلہ نگار کے لیے نا قابل برداشت تھی۔

مراسلہ نگار نے یقیناً بہت سے پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکسانیوں کی اکثریت کن لوگوں کو اپنا ہیرو سمجھتی ہے؟ لیکن اس سے بھی پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستانیوں کی اکثریت اس معاملے میں آزاد ہے کہ کن لوگوں کو اپنا ہیرو سمجھے اور کن کو ہیرو تسلیم نہ کرے؟

ہیرو کا نام سن کر اکثر لوگوں کے ذہن میں خوبرو اور دلکش شخصیت کے مالک ایک جوان رعنا کا تصور آتا ہے جو تازہ ترین فیشن کی پوشاک زیب تن کئے ہوئے ہے، اس سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں، گلے میں سنہری لاکٹ ہے، اڑتے ہوئے بالوں کی لٹ ماتھے پر گری ہوئی ہے۔ وہ کسی خوبصورت لڑکی کو غنڈوں سے چھڑا رہا ہے یا درخت کی شاخ پکڑ کر محبت کا گیت گا رہا ہے یا پھر تماشائیوں کے ہجوم میں زبردست انداز میں بالنگ کر رہا ہے۔ بیٹ ہاتھ میں پکڑے چوکے اور چھکے لگا رہا ہے۔ امیر اور خوبصورت عورتوں میں گھرا ہوا ہے۔ عوامی بہبود کے لیے اس نے جو منصوبہ پیش کیا ہے' اس کے عشائیوں کا ٹکٹ دو دو ہزار روپوں کا ہے۔ استانیاں ٹکٹوں کی کاپیاں بچوں میں دیوانہ وار تقسیم کر رہی ہیں اور ننھے منے بچے گھر گھر جا کر لوگوں کی منتیں کر کے ٹکٹ فروخت کرنے کے جتن کر رہے ہیں۔

یہ ہیں ہمارے ہیرو! انہیں کو ذرائع ابلاغ ہیرو بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اخبارات اور ہفت روزوں کے صفحوں کے صفحے ان کی بڑی سائز کی رنگین تصویروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ صبح شام ان کے انٹرویو شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے معمولات، عادات ذاتی زندگی کی تفصیلات، معاشقوں کے اتار چڑھاؤ اور ایک ایک لمحے کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ ان کی عید کیسے گزری، انہوں نے سویاں کس طرح کھائیں۔ انہوں نے قربانی کے بکرے کس سائز کے ذبح کئے۔ انہوں نے پتنگیں کیسے اڑائیں، بچپن میں سکولوں سے کیسے بھاگے، ماں باپ کی نافرمانیاں کس کس طرح کیں۔ بیویوں سے علیحدگی کس کس وجہ سے ہوئی، پسندیدہ رنگ کون سا ہے، صابن کون سا استعمال کرتے ہیں، کس برانڈ کی شیونگ کریم کو

شرف بخشتے ہیں۔ یہ سب تفصیلات شائع ہوتی ہیں اور بار بار شائع ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کو حفظ ہو جاتی ہیں۔ ریڈیو سے انہی کی تذکرے نشر ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ہر چینل پر انہیں کے اشتہار، انہیں کے انٹرویو اور انہیں کی کارکردگی کے تجزیئے ہوتے ہیں۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارا ہیرو وہ کسان نہیں جو کھدر کے کپڑے پہنے چلچلاتی دھوپ میں گندم بوتا ہے اور کاٹتا ہے۔ وہ گندم جس کی بنی پیسٹریاں، ڈبل روٹیاں اور نان محلات میں اڑائی جاتی ہیں اور خود وہ کسان لسی اور چٹنی سے سوکھی روٹی کھاتا ہے۔ ہمارا ہیرو وہ مزدور نہیں جو سیاہ رنگ کی ڈانگری پہنے لوٹا کوٹتا ہے اور جن کی مشقت کی وجہ سے پوری قوم آرام وعشرت کی زندگی گزار رہی اور جو خود قوت لایموت پر گزر اوقات کر رہا ہے۔ ہمارا ہیرو وہ سپاہی نہیں جو کئی کوئی موسم زمین دوز مورچوں میں اور برف کے طوفانوں میں گزار دیتا ہے تاکہ دوسرے آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور جس کی ہڈیاں ٹینکوں کے نیچے کڑکڑاتی ہیں تاکہ قیمتی ساز وسامان سے بھرے ہوئے گھر' آگ کے شعلوں سے بچ سکیں۔ ہمارا ہیرو وہ بندوقچی نہیں جس نے پھٹے ہوئے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ ہماری سرحدوں سے ان سوویت فوجوں کو پرے دھکیلا، جن کے ہاتھ ہمارے نرخرے پر تھے۔ ہمارا ہیرو وہ کشمیری نوجوان نہیں جو اپنے گھر ماں باپ بھائی، بہنوں اور اپنی آنکھوں، بازوؤں، ٹانگوں حتیٰ کہ جان کی قربان دے کر اس برہمن کو روک رہا ہے۔ جس کی نظریں ہمارے گھروں کے دروازوں پر ہیں۔ ہمارا ہیرو وہ طالب علم نہیں جو کسی کچے گھروندے میں لالٹین کی روشنی میں یا کسی گلی میں کمیٹی کے بلب کی دھندلی روشنی میں پڑھ رہا ہے۔ ہمارا ہیرو عبدالستار ایدھی نہیں جو خلق خدا کے آسائش کے لیے گلی گلی بھیک مانگتا پھر رہا ہے۔ اس لیے کہ اس کے کپڑے معمولی ہیں اور اس کی شخصیت میں گلیمر نہیں۔ ہمارا ہیرو ڈاکٹر حمید اللہ ہے، نہ ڈاکٹر عبدالقدیر۔ ہمیں دانشور چاہئیں نہ عالم فاضل نہ سائنس دان نہ سماجی کارکن۔ ہمارے دلوں میں تو فلموں کے ہیرو دیکھ کر لہریں اٹھتی ہیں اور ہمارے دماغوں پر کرکٹ اور سکوائش کے سپر سٹارز حکمرانی کرتے ہیں۔ قوم کا ہر بچہ فلمی ہیرو بننا چاہتا ہے یا کھیل کا سپر سٹار اور اگر یہ تمام بچے فلمی ہیرو اور کرکٹ اور سکوائش بن گئے تو ہمارے پاس تو عرب بھائیوں کی طرح تیل کے چشمے اور سونے کی کانیں بھی نہیں۔ جن کی آمدنی سے ہم ڈاکٹر، انجینئر، مزدور اور لڑنے والے سپاہی درآمد کریں گے۔

مدت ہوئی ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں بصارت سے محروم ایک طالب علم نے تمام سوالوں کے صحیح جوابات دے کر کار جیتی تھی۔ پریس نے غلطی سے اس کا انٹرویو لے لیا تھا۔ اس نابینا بچے کی ایک بات یاد آ رہی ہے کہ یہاں گہرائی اور سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سٹیج پر محمد علی شہکی اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان اکٹھے ظاہر ہوں تو سارا ہجوم محمد علی شہکی کے اردگرد ہوگا اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان اکیلا کھڑا ہوگا۔

(بشکریہ: روزنامہ ''جنگ'' ۱۹/اگست ۲۰۰۳ء)